دہقان کی سختی تھی لیکن اس میں گالیوں کا تعفن نہیں تھا۔ اس نے میرے سامنے پیلی پیلی ہاڑیوں اور سیاہ آلو بخاروں کا ایک چھکور رکھا ہوا تھا اور بار بار کھانے پر اصرار کر رہا تھا حالانکہ میں دونوں چیزیں تواتر کے ساتھ کھا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سکون اور طمانیت کے وہی آثار تھے جو غریب الوطنی میں دو ہم وطنوں کے قریب آنے پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ میرے اس قدر قریب آجانے پر بہت خوش تھا اور میں اس کے نزدیک معمولے کی طرح محتاط سا بیٹھا تھا۔ الیاس بہت دلچسپ' بہت پیار اور بیحد ملنسار شخص تھا اور محبت اس کے اندر چولہے چڑھی ہنڈیا کی طرح ہر وقت جوش مارتی اور کھدبد کرتی رہتی تھی۔ وہ ہر وقت اپنے رب کی صفت ثناء میں مصروف رہتا اور جب فراغت کا کوئی لمحہ آتا تو منہ بند کر کے اندر حمد اور ورد کرنے اور باہر سانپ کی طرح لہرانے لگتا۔ پھر اس پر جنون کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی۔

الیاس فرسٹ ڈویژن میٹرک جنجوعہ جاٹ' ہیر وارث شاہ کا حافظ' کبڈی پلیئر' نعت خواں اور شرمیلے نینوں والا جوان تھا۔ ان ساری چیزوں کو آپس میں ضرب دے کر اس نے "عشق" کا حاصل ضرب نکالا ہوا تھا اور عشق اس کو صرف خدا کی ذات سے تھا اور خدا اسے نہ ملا تھا نہ ملنا تھا اور نہ ہی اس کے ملنے کی کوئی امید تھی۔ اس کے پیر نے اونچی آواز دے کر کہہ دیا تھا جا الیاس عشق کر' اس ذات کے ساتھ جس نے ساری عمر ہاتھ نہیں آنا۔ جلوہ نہیں دکھانا' صلح نہیں مارنی' نیڑے سے ہو کے لنگھ جانا ہے پرت کے نہیں دیکھنا۔"

جب میں نے اس سے اس کے پیر کی بابت پوچھا تو ہنس کر کہنے لگا "میرا اندر ہی میرا پیر ہے کوئی باہر والا تو نہیں۔ مجھے اندر سے ہی یہ آواز آئی تھی' ٹھیک ہے؟"

اب میں اسے کیسے بتاتا کہ "ٹھیک ہے۔" مجھے تو نہ کبھی اندر سے آواز آئی اور نہ ہی کسی نے باہر سے اس زور سے پکارا تھا پھر میں کس طرح سے اس کی تصدیق کرتا۔ بس مسکراتا رہا اور اس کی باتیں سنتا رہا۔

الیاس ایک بہت بڑا فراڈ تھا اور اس کو بالکل علم نہیں تھا کہ وہ ایک فراڈ ہے۔ وہ اس شاعر کی مانند تھا جو غریبوں' دکھیاروں' تنگدستوں اور کم مایہ لوگوں پر نظمیں لکھ کر ظالموں' سرمایہ داروں اور ستم کیش وجفا جو انسانوں کو دار پر کھینچا کرتا ہے اور اس کو بالکل علم نہیں ہوتا کہ وہ خود بھی ایک انتہا درجے کا لالچی' حریص' خود غرض اور موقع پرست انسان ہے۔ وہ بڑی نیک نیتی اور خلوص دل کے ساتھ شاعری کئے جاتا ہے اور ظلم کو للکارتا رہتا ہے۔ وہ شخص بہ یک وقت اچھا بھی ہوتا ہے اور نہیں بھی ہوتا۔

11

جب میں ایک ہفتہ کی چھٹی پر لاہور آیا تو مجھے اپنے استاد کے دو خط ایک ساتھ ملے۔ یہ انہوں نے لاہور کے پتہ پر لکھے تھے اور میری غیر موجودگی میں آئے تھے۔ ایک میں تفصیل کے ساتھ تخت پور کے حالات درج تھے اور بڑا لمبا خط تھا۔

لکھا تھا' رجنی کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے اور وہ اپنے شوہر سے لڑ کر تخت پور آ گئی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے سسرال والوں نے خود اسے گھر سے نکال کر واپس میکے بھیج دیا ہے' لیکن اصل بات کسی کو بھی معلوم نہیں سوائے میرے۔ میں رجنی سے ملا نہیں اور نہ ہی میں نے اس کو کہیں دیکھا ہے۔ نہ ہی مجھے کسی نے اس کا کوئی پیغام دیا ہے' لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ بہت دکھی ہے اور ہر وقت روتی رہتی ہے..... تم پوچھو گے کہ مجھے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا تو سنو کہ آدھی رات کے وقت اس کا گھر والا میرے چوبارے میں آ کر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور روتے ہوئے بولا رجنی کو بچا لو نہیں تو وہ رو رو کر اپنے پران دے دے گی۔ تمہارا تو کچھ نہیں جائے گا میرا سنسار اجڑ جائے گا۔ وہ تم سے پریم کرتی ہے اور ہر گھڑی تمہاری یاد میں ڈوبی رہتی ہے۔"

میں نے اس کو ٹھنڈا پانی پلایا۔ موڈھے پر بٹھایا۔ کندھے پر ہاتھ رکھا۔ تسلی دی اور پوچھا "تم ہی بتاؤ اس سلسلے میں تمہاری یار جنی کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

اس نے کہا "تم بھی اس سے اتنا ہی پریم جتاؤ جتنا وہ جتاتی ہے۔" "تم بھی اس کو اتنا ہی یاد کرو جتنا وہ کرتی ہے' جیسے خیالوں میں وہ ڈوبی رہتی ہے ایسے ہی تم بھی رہو۔"

میں نے ہنس کر کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے پنڈت جی۔ وہ تمہارے پاس بھاگسر میں' میں یہاں تخت پور میں۔ اس کو کیسے یقین دلاؤں کہ میں ہر وقت اس کے وچاروں میں ڈوبا رہتا ہوں اور اس سے پریم کرتا ہوں۔"

OCIETY.COM

اس نے رو کر کہا "رجنی نے دھرم ناش کر لیا ہے اور وہ مسلمان ہو گئی ہے۔" اس کا ہر دے مکے سے اٹک گیا ہے اور اس کے اندر سے مکے مدینے کی ناد آتی ہے' میں نے اس کے سینے سے کان لگا کر خود سنی ہے۔"

میں نے کہا "یہ تمہارا وہم ہے' ایسی کوئی بات نہیں' بعض اوقات خیال کے زور پر ایسی آوازیں آنے لگتی ہیں۔" لیکن اس نے میری بات نہیں مانی اور اپنے کہنے پر اڑا رہا کہ رجنی کے اندر ناد علی بجتی ہے۔ میرا خیال ہے اس کا دماغ پھر گیا ہے اور وہ اپنی جگہ سے ہل گیا ہے۔ اگر تم یہاں ہوتے تو مجھے بڑا سہارا ملتا لیکن اب میں بالکل اکیلا ہو گیا ہوں۔ سارا دن اپنے کمرے میں لیٹے رہنا۔ شام کو نہا دھو کر پھر لیٹ جانا۔ صبح اٹھ کر منہ ہاتھ دھونا۔ مسواک کرنا اور پھر لیٹ جانا۔ شام کو اگر طبیعت مان جائے تو تھوڑا سا ریاض' نہیں تو پھر اسی طرح سے در و دیوار کو گھورتے گھورتے رات تک پہنچ جانا۔

میرے استاد ماسٹر بالی بات تو خوب کرتے تھے لیکن میں نے ان کی تحریر اس سے پہلے ایسی نہ دیکھی تھی۔ تنہائی نے' اداسی اور مجبوری نے اور انسانوں کے ایک بڑے سمندر میں بالکل الگ تھلگ ہونے کی وجہ سے ان کی تحریر میں ایک اور طرح کی سوچ ابھر آئی تھی اور وہ اچھے خاصے لیکھک بن گئے تھے۔

خط میں لکھا تھا کہ لچھو بساطی مر گیا ہے اور اس کے بیٹے گوراں دتے نے دکان سنبھال لی ہے۔ دکان سنبھالنے کے بعد سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ میرے چوبارے کا کرایہ پانچ روپے بڑھا دیا ہے۔ میں خوش ہوں کہ اس نے پانچ روپے ہی بڑھائے زیادہ بڑھا دیتا تو میں اس کا کیا بگاڑ لیتا۔ تخت پور میں پنڈی اور منٹگمری کے بہت سے شرنارتھی آ گئے ہیں اور انہوں نے سارے شہر کو گندا کر دیا ہے۔ کچھ نئی دیواریں اٹھالی ہیں کچھ نفرتیں بڑھالی ہیں۔ اب یہاں وہ پہلے والی بات نہیں رہی۔

کرموں بنئے کے بیٹے نے اپنے باپ کے ہاتھوں تنگ آ کر پستول سے خودکشی کر لی۔ بنئے کا بیٹا تھا۔ ساری عمر پستول کی شکل تک نہ دیکھی۔ چلانے کا ڈھنگ معلوم نہ تھا۔ نشانہ چوک گیا خود بھی گرا اور پستول بھی ہاتھ سے چھوٹ کر پرے جا پڑا۔ تھانے والوں نے گرفتار کر لیا۔ اقدام خودکشی کا پرچہ تو نہیں ہوا البتہ بنا لائسنس پستول رکھنے کا مقدمہ بن گیا۔ اب چھ مہینے قید بامشقت کی سزا ہو گئی ہے۔ خوش ہے کہ کرموں کے ظلم و ستم سے نجات ملی' خواہ چھ مہینے کے لئے ہی سہی!

WWW.PAK

خط کے آخر میں اس حسرت کا اظہار بھی تھا کہ رجنی کا بچہ دیکھنے کو بڑا دل چاہتا ہے پتہ نہیں کیسا ہے۔ شکل وصورت کیسی ہے اور کس پر گیا ہے۔

ان کے اس طویل خط کو پڑھ کر طبیعت بشاش ہو گئی۔ دل ان کی زیارت کو مچلنے لگا۔ پتہ نہیں اب ان کی شکل وصورت کیسی ہو گی اور کس طرح کے دکھائی دیتے ہوں گے۔

دوسرا خط کھولا۔ اس پر دس دن بعد کی تاریخ تھی۔ لکھا تھا: گور پر بھد کے روڑ کڑاہ چھک کر اور کڑا پہن کر واہگورو کا خالصہ بن گیا ہوں۔ نام میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ آئندہ خط اس پتہ پر لکھنا۔ ماسٹر بھائی اقبال سنگھ۔ کلارنٹ نواز۔ چوبارہ پھوبسا طی۔ چوک بزار۔ تخت پور۔

اس مختصر سی عبارت کو پڑھ کر مجھے ایک چکر سا آیا اور میں قریبی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ماں نے قریب آ کر میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور گھبرا کر بولی "کیا بات ہے تیرا پنڈا تو بالکل برف ہو گیا ہے!

میں نے ماں کا ہاتھ پرے دھکیل کر منہ موڑ لیا لیکن ادھر بھائی اقبال سنگھ کھڑا تھا۔

OCIETY.COM

۱۱

آزاد کشمیر ریڈیو واپس پہنچ کر کام تو شروع کر دیا لیکن اندر ایک موت سی واقع ہو گئی تھی۔ دل میں ہر وقت ایک پھوڑی سی بجھی رہتی۔ خیالات آتے اور پر سادے کر چلے جاتے۔ کبھی کبھی کوئی پرانا بزرگ سا سفید ریش خیال آتا تو اس کے گلے لگ کر رونے لگتا۔ یوسف ظفر کو یقین ہو گیا تھا کہ مجھے کسی سے عشق ہو گیا ہے اور اس نے میری محبت کے ہاتھ کو اپنے دامن سے جھٹک دیا ہے۔ محمد حسین بہت ہی جذباتی اور مشفق قسم کا انسان تھا۔ وہ مجھے چھوٹے ہوٹلوں پر چائے پلاتا۔ ساتھ گھماتا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر بار بار کہتا "اپنے اندر کی بات ایک مرتبہ تو بتا دے۔ اپنے دکھ کا اظہار کر کے تو دیکھ۔ ہم تیرے دوست ہیں۔ ناکرنی بھی کر کے دکھا دیں گے۔ جان بھی لڑا دیں گے۔ ہر مشکل میں تیرا ساتھ دیں گے کہ ہم بھاگ جانے والوں میں سے نہیں لیکن تو کچھ کہہ تو سہی۔"

اب میں اس سے کیا کہتا اور کیا بتاتا اور کدھر سے کہانی شروع کرتا کہ وہ میرے غم میں شریک ہو کر میرے دکھ کا مداوا کرتا اور ماسٹر بالی کے نئے پتے میں اس کا نام پرانی املا پر لوٹا دیتا۔ بڑا بوجھ تھا جو دن پر دن بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ سارا دن خاموش رکھتا اور شام کو ہوٹل کے کمرے میں لے جا کر آنسوؤں میں بھگو دیتا۔ میں کوئی ایسا خاص مسلمان بھی نہیں تھا' خاص کیا ایک عام سا مسلمان بھی نہیں تھا نہ مذہب کے بارے میں کچھ پڑھا تھا اور نہ ہی سوچا تھا۔ پھر پتہ نہیں کیوں استاد کی اس تبدیلی مذہب نے میرے دل پر آری سی چلا دی تھی۔ چلا کیا دی تھی ہر وقت چلتی رہتی تھی۔ بار بار میں دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا اور بار بار رک کر پیچھے کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو جاتا۔ جب تک میرا دوسرا حصہ آدھا کٹا ہوا وجود آگے بڑھ کر مرے بقیے سے واصل نہ ہو جاتا میں اسی طرح کھڑا رہتا۔ یہ میری مجبوری تھی۔ اس آدھے حصے کو پیچھے چھوڑ کر آگے کیسے بڑھ سکتا تھا۔

WWW.PAKS

سائیں بابا سنگل شاہ' محمد الیاس جنجوعہ' اب بھی انسان کو اور انسانی رشتوں کو گالیاں دیئے جاتا تھا۔ جب تھک کر نڈھال ہو جاتا تو منہ اوپر اٹھا کر خدا کو طعنے مہنے دینے لگتا کہ اچھی کری ہمارے ساتھ! یاری بھی لگائی اور پاس بھی نہیں آئے۔ پاس بھی نہیں آئے اور کوئی پیغام بھی نہیں بھیجا۔ پیغام بھی نہیں بھیجا اور اپنی بولی بھی نہیں سنائی۔ بولی نہیں سنائی تھی تو کوئی رمز ہی بتا دیتے۔ رمز بتانی مشکل تھی تو جلوہ ہی دکھا دیتے۔ جلوے میں بیہوشی کا ڈر تھا تو کوئی روپ بنا کر چھا نجھر پہن کے جھومر ڈال کر ہی آ جاتے۔ اتنی عورتیں روز یہاں سے گزرتی ہیں پاپیادہ' ٹٹوؤں پر' لاریوں میں موٹروں پر' کسی ایک میں اتر کر آ جاتے' ہمیں درشن ہو جاتے موری کو سواد آ جاتا۔ وہ چل پڑتی ہم دیکھتے رہتے ہم بیٹھے بھلے وہ چلتی بھلی۔

جس روز میں نے اپنے دل کا درد سنگل شاہ کو سنانے کا تہیہ کیا اس نے میرا چہرہ بھانپ کر اپنی رام کہانی شروع کر دی کہ ایم اے او کالج امرتسر میں دو سال برباد کرنے کے بعد میں ایف اے کا امتحان دیئے بغیر ہی واپس گاؤں آ گیا۔ میری تیاری اچھی تھی۔ پچھلے امتحانوں میں نمبر بھی ٹھیک ٹھاک لیے تھے۔ پروفیسر حضرات میری ہائی سیکنڈ ڈویژن مان کر کالج کے پاس پرسنٹیج کا حساب نکالتے تھے اور میں کم از کم بی اے ضرور کرنا چاہتا تھا لیکن میں مجبور ہو کر سالانہ امتحان سے پانچ دن پہلے گاؤں واپس آ گیا۔ دراصل میرے دل پر جلوے اترنے لگے تھے اور میرے اندر اتنی روشنی ہو جاتی تھی کہ باہر کے لوگ میرے رگ و ریشے' ناڑیاں اور ہڈیاں دیکھ سکتے تھے۔ جب کبھی کوئی جلوہ اترتا میں گھبرا کر کلاس روم سے یا ہوسٹل کے کمرے سے باہر نکل آتا اور بغلوں میں ہاتھ دبا کر تیزی سے بھاگنے لگتا۔ اس تیزی سے بھاگنے کی بنا پر اردگرد کے لوگ میرے وجود کے روشن اور منور شوکیس کو اچھی طرح سے دیکھ نہ سکتے۔ وہ مجھے "کیا ہو گیا الیاس؟" کہہ کر گزر جاتے۔ جلوہ سامانی کی یہ کیفیت اس وقت تک جاری رہتی تھی جب تک میں گھاس کے کسی ٹکڑے پر روبقبلہ بیٹھ نہ جاتا اور اپنا سر پیچھے نہ ڈال دیتا۔

سنگل شاہ نے کہا "یہ بکھیڑا کوئی ایک آدھ دن کا ہوتا تو میں اسے برداشت بھی کر لیتا لیکن ایسا تو ہر دوسرے چوتھے ہونے لگا تھا۔ میں کب تک بھاگتا اور کہاں تک گھاس کے قطعے دریافت کرتا۔ مناسب یہی جانا کہ واپس چلا جائے اور آرام سے گھر میں قیام کیا جائے۔ چنانچہ میں فتح گڑھ چوڑیاں آ گیا اور پرسکون ہو گیا۔

میں اپنے عشق کے دروازے پر کھڑا تھا اور میرے سامنے منظور شدہ ملکوتی وجود اپنی اپنی باری پر باب قبول میں داخل ہو رہے تھے۔ چوبدار نے پرچیاں پھر دیکھتے ہوئے ایک پرچی

OCIETY.COM

پر میرا نام دیکھ کر کہا ابھی تمہارا نمبر دور ہے' لیکن تم کونسے عشق میں اترنا چاہتے ہو اس کا خانہ تک نہیں ہوا۔ دیکھ لو اور سوچ لو اور کل تک مجھے بتا دو دونوں ایک جیسے طاقتور ہیں۔

میرے اندر ایک ہی تانت بج رہی تھی اور اس نے ایک ہی الاپ اٹھایا ہوا تھا۔ رب کے عشق کا اور اسم ذات کی لگن کا۔ عشق حقیقی کا اور عشق کیا ب کا..... ایسی طبیعت ہو گئی تھی کہ عرش فرش مال و دولت' زمین جائیداد' کھیت مربعے' کھانا پینا' اوڑھنا بچھونا کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ بس ایک ہی تار بندھا تھا اور اس پر ایک ہی نام گونج رہا تھا' حق! حق!! حق!!!

شام کے وقت اچانک ہمارے گھر ساتھ کے گاؤں کے بہت سے مہمان آ گئے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ بچے بھی اور جوان لڑکیاں بھی۔ تین اونٹوں اور پانچ گھوڑوں کے مسافروں سے ہمارا سارا گھر بھر گیا۔ اندر باہر لوگ کام پر جت گئے۔ میری ماں نے مجھے ایک دھلا دھلایا مجنوں نکال کر دیا اور کہا "جلدی سے لالو تھیوری کے تندور سے پچاس روٹیاں لگوا لا۔" جب میری ماں مجھے مجنوں دے کر یہ سمجھا رہی تھی کہ وہاں سے ہلنا نہیں۔ وہ کہے بھی خود بھجوا دوں گی پھر بھی وہیں کھڑے رہنا روٹیاں خود لانا پانچ تھالیں برابر کی لگوا کر دھیان سے مجنوں میں لپیٹنی ہیں۔ پولی گانٹھ باندھ کے گٹھڑی لٹکا کے لانی ہے کندھے پر یا سر پر نہیں دھرنی۔ کوئی کہے بھی کہ چودھری صاحب میں چھوڑ آتا ہوں تو اس کو نہیں دینی خود لے کر آنی ہے۔" جب میری ماں مجھے یہ ہدایات دے رہی تھی تو مہمانوں کی ایک لڑکی رابعہ بھی ہمارے پاس کھڑی تھی اور میری ماں کی باتیں سن سن کر ہنس رہی تھی۔ اس نے ڈبیوں والا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ پیروں میں کالی گرگابی تھی آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پر سرخی تھی۔ ماتھے کے بالوں کو پف کر کے اوپر اٹھایا ہوا تھا اور ناک میں سونے کی تلی تھی۔ اس لڑکی کی کمر اتنی چھوٹی تھی کہ میرے بڑے بھائی سلطان کی ایک مٹھی میں آ سکتی تھی۔ رابعہ کی دونوں گتیں اس کے سینے پر سے ہو کر قمیص کے دامن تک لٹک رہی تھیں اور دونوں پر اندوں میں سفید گوٹے سے مڑھے چار بڑے بڑے چھکے جھول رہے تھے۔ لٹکتی ہوئی گتوں اور اس کے پیٹ کے درمیان کوئی فٹ ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا "چاچی! بھا الیاس پچاس روٹیوں کا گٹھڑ کس طرح لٹکا کر لائے گا اس کے ساتھ کوئی بردا بھیج دے' کہیں آج رات ہم بھوکے ہی نہ رہ جائیں۔" وہ پھر ہنسنے لگی اور اس کی ہنسی میں میری ماں بھی شامل ہو گئی۔

لالو تھیوری کام تو اب بھی کرتی تھی پر تندور کے سامنے بیٹھ کر روٹیاں نہیں لگاتی

WWW.PAK

تھی۔اب یہ کام اس کی بیٹی عنیتی کے ذمے تھا جو اپنے دونوں کانوں کے پیچھے لہریا دوپٹہ اڑس کر تنور میں روٹیاں لگاتی تھی اور ہر پیڑا اٹھانے سے پہلے ایک کہنی کا مسح ضرور کرتی تھی۔ تندور میں جھک کر روٹی لگاتے ہوئے یا روٹی اتارتے ہوئے وہ سر باہر نکال کر اپنے کانوں کے آویزوں کو کونڈے میں انگلیاں ڈبو کر ٹھنڈا ضرور کرتی تھی۔ بیچاری کے پاس یہی ایک زیور تھا وہ بھی پیتل کا۔ گھڑت اچھی تھی اور جوگیوں کے مندروں سے ملتی تھی۔ لالو جھیوری کے جگر میں ورم آگیا تھا اور وہ زیادہ وقت چارپائی پر ہی گزارتی تھی۔ چارپائی پر پرات رکھ کر آٹا گوندھ لیتی۔ وہیں بیٹھی بیٹھی پیڑے بنا دیتی۔ گرم روٹیاں کندوری میں لپیٹ کر الگ الگ چھابوں میں رکھ دیتی۔ پرانے آٹے میں سے سسری بین لیتی۔ لیٹے لیٹے چودھریوں کے نواسوں پوتوں کے لئے آٹے کے شیر' چڑیاں اور بکریاں بھی بنا دیتی۔ دونوں ماں بیٹی کا کام تو اچھا تھا پر ان کے سر پر کوئی مرد نہیں تھا۔

جب میں پچاس روٹیوں کا گٹھڑ لٹکا کر اندر داخل ہوا تو رابعہ نے لپک کر وہ گٹھا میرے ہاتھ سے لے لیا۔ میں نے کہا "رہنے دو بہت بھاری ہے۔" تو وہ آنکھیں جھلا کر بولی 'میں تو اس کے ساتھ لانے والے کو بھی اٹھا سکتی ہوں یہ کیا بوجھ ہے۔"

اس نے گٹھا اٹھا تو لیا پر بہنگی کی طرح کم بوجھ والی سائیڈ پر لچکتی چلی گئی۔

اتنا کہنے کے بعد سنگل شاہ خاموش ہو گیا اور اپنی گود میں پڑی ہوئی موٹے سنگل کی ایک لٹ سے کھیلنے لگا۔ میں اس کی کہانی کی گھٹتی بڑھتی لہروں کے تجسس میں ڈوب رہا تھا ابھر رہا تھا اور مجھ کو تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ وہ خاموش ہو گیا تو میں بھی خاموش رہا۔ پھر اس نے زور کا ایک نعرہ مارا اور بھائی کے رشتے کو ایک گندی گالی سے یاد کیا۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر اس کی جانب غور سے دیکھا تو اس نے سر جھکا لیا اور ایک لمبی سی ہونہہ کے ساتھ بولا "برادران یوسف ازل سے ایک طرح کے رہے ہیں اور ابد تک اسی طرح سے رہیں گے..... میرے بائیں کان میں انحد باجہ بجنے لگا تھا اور میں ہر وقت سرحدی گیت کے لوچ میں ڈوبا رہتا تھا۔ یہ آواز ایک سنکھر اور گھڑیال کی ملی جلی آواز تھی۔ کبھی مدھم ہو جاتی اور کبھی اتنے زور سے اٹھتی کہ میرا سارا بدن پھٹنے لگتا۔ جیسے جیسے میں اس سے لاتعلق ہوتا اس کی لے اور بڑھ جاتی۔ میرے ملاپ کے دن قریب آگئے تھے اور میں واصل ہونے والا تھا کہ ایک شام مجھے لالو جھیوری کی بیٹی عنیتی کھیتوں میں مل گئی۔ اس نے بہت سا ایندھن اکٹھا کر کے ایک بڑا سا گٹھا باندھ لیا تھا اور کسی اٹھوانے والے کی راہ دیکھ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر گٹھا اٹھوایا تو

OCIETY.COM

میرا ہاتھ پھسل گیا اور گٹھا اس کے سر سے نیچے گر گیا۔ میں اس کا بازو پکڑ کر اسے مکئی کے کھیت میں لے گیا اور جب میں نے اس کی قمیص کا دامن اٹھا کر اس کی گرم گرم چھاتیوں پر اپنا چہرہ رکھا تو وہ ہنسنے لگی اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولی "اپنے اپنے گھرانے کی ریت بالکل ایک سی ہوتی ہے تو بھی اپنے بھائی جلال جیسا ہی ہے۔" میں نے چہرہ اٹھا کر اس کی طرف غور سے دیکھا تو وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیر کر کہنے لگی "جس کام کے لئے تو مجھے مکئی کے کھیت میں لایا ہے تیرا بھائی بھی میرے ساتھ یہی کام کر چکا ہے۔ وہ بھی بہت اچھا ہے اور وہ بھی تیری طرح دلیر ہے۔" اس دن سے مجھے سارے انسان' سارے رشتے' ماں باپ' بہن بھائی عزیز رشتہ دار انگ ساک زہر لگنے لگے۔ میں گھر بار' بہن بھائی' اڑوس پڑوس' یار بیلی سب کو چھوڑ کر رات کے وقت گاؤں سے نکل گیا اور جنگلوں بیلوں میں گھومنے لگا۔ دن کے وقت درگاہوں پر حاضری دیتی اور راتوں کو کبھی ٹیک لگا کر کبھی سیدھے پدھرے لیٹ کر وقت گزار دینا۔ انحد باجے کی جھنکار بند ہو گئی تھی اور میں نے پاؤں میں گھنگھرو باندھ لئے تھے۔ بابا شاہ طربام کے عرس پر مجھے سدا سہاگنوں کی ایک ٹولی مل گئی اور میں ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ زلفیں بڑھالیں۔ ہاتھوں میں چوڑیاں پہن لیں' ناک میں نتھنی اور کانوں میں ڈنڈیاں ڈال لیں۔ پیلا گھاگرا اور سر پر لال چنری لے کر میں ترچھا ناچنے اور گول جھومر ڈالنے لگا۔ میری کوک سن کر لوگ چھکڑے ریڑے روک کر اور دکانیں کھلی چھوڑ کے ہماری منڈلی کے گرد جمع ہو جاتے اور بت بن کر ہمیں جلبی ڈالتے دیکھتے۔ ہم جلیاں ڈالتے' کوک فریاد کرتے' ناچ ناچتے ایک عرس سے دوسرے عرس پر پہنچتے اور ہمارا سال ختم ہو جاتا۔ پورے پانچ سال اور تین مہینے میں نے نہ تو اپنی نتھنی بدلی اور نہ سر ڈاڑھی کے بال منڈوائے۔ جلبی ڈالنے جھومر بھرنے ہاکاں مارنے اور کوک پکار میں چوڑیاں البتہ ٹوٹ جاتی تھیں سو عرسوں پر دنگاں والے اور مہنار نیں ہمارے ہاتھ پکڑ پکڑ کر نئی چوڑیاں خود چڑھا دیتے تھے۔

کانواں والی سرکار کے میلے پر ہیرو لوہاری نے مجھے سوا روپیہ اور لڈوؤں کا ایک لفافہ دان کیا اور میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اسے دفع دور کر کے دھتکار دیا۔ وہ رونے لگی تو میرے ایک ساتھی "سہاگن" نے زور سے اس کی کمر میں ایک دھموکا مارا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی اور اوڑھنی سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی "ایک مکا لگ گیا ایک کا کام مل گیا۔ دو لگ جاتے تو دو مل جاتے۔" اس نے اپنی کمر اور سرین میری طرف کر کے کہا "اڑیا ایک مکا تو بھی مار دے ایک کا کا تیری شکل صورت کا مل جائے گا۔" میں نے مکا ہوا میں لہرایا اور اس کی

WWW.PAK

کر دیکھتا رہ گیا۔ پھر ہم جلی ڈالنے لگے اور نرت دورے کرنے لگ گئے۔ لوگ کہتے تھے میر
بنی کی مروڑ اور میری کلائیوں کی لچک دکھنی عورتوں کی ہاتھ پھرت سے بھی سندر تھی۔ یہ
خیر میں نہیں جانتا پر میرے پیروں کی جھنکار میرے ساتھی سہاگنوں میں سب سے پھلر والو
سروپ دھار تھی۔"

جس کالی دھندراتری میں آدھی رات کے وقت مجھے انتر بھید کی روشنی ملی میں اپ
منڈلی چھوڑ کر اس جوت کے پیچھے چلتا چلتا حق اور سچ سے واصل ہو گیا۔ پیو لوہاری اپنے گھ
کے دروازے پر گہنوں کی پوٹلی باندھے بیٹھی تھی۔ رات کے اندھیرے میں ہم اس کے
گاؤں سے بہت دور نکل گئے۔ میرے پاؤں کے گھنگھرو اور ہاتھوں کی چوڑیاں بہت پیچھے ر
گئیں اور ہم سورج نکلنے سے پہلے پلکھو نالہ پار کر گئے۔

تین دن اور تین راتیں ہم نے لنڈا بازار کے ایک ہوٹل میں گزاریں اور پھر مجھے پیو
کے دکھی شوہر کا خیال ستانے لگا۔ منڈی مرید کے' کے ایک بے آباد اور ویران گھر میں میں
راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتا اور کرلاتا۔ پیو لوہاری مجھے تسلیاں دیتی' میرے آنسو پونچھتی اور میرا
سر اپنے لوہے جیسے سینے سے لگا کر مجھے لوریاں دیتی پر میری سسکیاں ختم نہ ہوتیں اور میں ہچکے
ہوتے اس کے بدن سے چمٹ کر سو جاتا۔ جس دن میرے دل سے وہم گمان اور لاج لپیٹ
کی شرم دور ہو گئی اور میں نے پیو لوہاری کا پنڈا چھوڑ کر اس کی مورتی من مندر میں رکھ کر اس
کے نام کا جاپ شروع کر دیا وہ مجھے چھوڑ کر واپس اپنے خاوند کے گھر چلی گئی۔

الیاس نے "حق اللہ بے شک اللہ" کا ایک زوردار نعرہ مارا اور اپنے بھائی کا نام لے کر
زمین پر پٹاخ سے تھوکا پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ "اس دن کے بعد سے میں نے سنگل
پہن لئے اور اپنے آپ کو جکڑ بند کر لیا۔ انسان جکڑ بند نہ ہو تو بے راہ ہو جاتا۔ کھلا ہوا ہو تو بے
حیا ہو جاتا ہے۔ دنوں کی منزل سالوں پر جا پڑتی ہے۔ پھر موت آجاتی ہے اور سارا کوڑ کباڑا
ایسے ہی دھرا رہ جاتا ہے۔" سنگل شاہ نے کلائیوں میں پڑے آہنی حلقوں کو زور سے ٹکرایا
اور اونچی آواز میں کہنے لگا "اس سنسار میں ایک ہی پیار ہے' حقا سچا پیار اور ایک ہی عشق ہے
واجب بر حق عشق اور وہ ہے رب کا پیار۔ باقی سب جھوٹ ہے اور ایویں خالی بھرم ہے۔ پر
"ب" اور "ن" کا جھگڑا شروع سے چلا آرہا ہے۔ بڑھ قدیم سے شروع ازل سے۔ رب کا پیار
ان کا پیار بن جاتا ہے اور ہوائی جہاز ٹھاہ کر کے گرتا ہے۔ ڈرائیور بھی فوت سواریاں بھی
فوت! جہاں گرتا ہے وہاں بھی سارے فوت!! پر اب میں نے سنگل ڈال لئے ہیں۔ دیہہ کی

OCIETY.COM

جکڑ بندی کرلی ہے۔ ن کا جھگڑا ختم ہو گیا ہے ب کا باقی رہ گیا ہے۔ سب کچھ فانی اک باقی سوہر دم باقی۔ "ب" باقی بر حق باقی" پھر وہ اونچے اونچے گانے لگا "سن باقی میری من باقی..... تیرا پچھا نہیں چھڈنا بھانویں لگ جان جھگڑیاں۔"

جھگڑیاں کے لفظ پر وہ دونوں بانہو اوپر اٹھاتا اور کلائیوں کے کڑوں کو آپس میں یوں بجاتا کہ بدن سے لپٹے ہوئے سارے سنگل کھڑکنے لگتے۔

WWW.PAK

۱۲

پشاور سٹیشن نے کچھ اپنی مہربانی کی بنا پر اور کچھ ہمارا حق مان کر ہمارے ریڈیو سٹیشن کے لئے اپنی ایک آرٹسٹ بھیج دی تھی۔ یہ گانا بجانا تو کم جانتی تھی البتہ باتیں کرنے کی بہت شوقین تھی۔ اس کے ساتھ اس کا ایک چھوٹا بھائی اور بڑے بڑے پھولوں کے سوٹ والی ایک بھاری بھر کم ماں بھی تھی۔ ماں لڑکی کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت تھی لیکن لڑکی جوان تھی اور اپنے سامنے کسی کو ٹھہرنے نہیں دیتی تھی۔ جس طرح جوان اور منہ زور گھوڑے کا تانگہ اسٹینڈ پر زیادہ دیر تک کھڑے رہنا مشکل ہو جاتا ہے اسی طرح اس لڑکی کے لئے ایک کمرے میں ٹک کر بیٹھنا محال تھا۔ سٹیشن پر ایک مدت سے چونکہ ہم مرد ہی مرد تھے اس لئے زمرد کا آنا ہمارے لئے رحمت کا باعث بن گیا۔ سازندے تو اس کی برادری کے لوگ تھے ہی، ہم لوگ بھی اپنے اپنے تھان پر ایک نئے انداز میں ہنہنانے لگے۔ ایسی باتیں ہم نے اس سے پہلے اپنے منہ سے کبھی نہ سنی تھیں۔

زمرد کے معاملے میں مفتی جی اور مسعود میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ مسعود میوزک انچارج تھا اور یہ آرٹسٹ بلاواسطہ طور پر اس کی تحویل میں آتی تھی۔ مفتی جی اس کو ڈرامہ و وائس کے طور پر ڈراموں میں استعمال کرنا چاہتے تھے۔ یوسف ظفر اسی سے پانچ منٹیہ تقریریں پڑھوانا چاہتے تھے اور ڈیوٹی آفیسر کسی کو پوچھے بتائے بنا اس سے دو تین مرتبہ اناؤنسمنٹس بھی کروا چکا تھا۔ مفتی اور مسعود کا جھگڑا طول کھینچ گیا تو ان کے درمیان نوٹا نوٹی چلنے لگی۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر علی صاحب نے دونوں کو باری باری اپنے کمرے میں بلا کر سمجھایا لیکن کوئی بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ ہوا۔ معاملہ نظامی صاحب تک پہنچا تو انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ زمرد کو واپس بھیج دیا جائے۔ واپسی کا فیصلہ سن کر مردوں کی دنیا اندھیر ہو گئی اور سب نے آپس میں صلح کر لی۔

OCIETY.COM

ہر شخص جو زمرد سے علیحدگی میں ملتا تھا ایک ہی بات کہتا تھا کہ "میں بہت اکیلا ہوں اور اداس ہوں مجھے سہارا دو۔" وہ بھی ہنس کر ایک ہی جواب دیتی کہ میں کوئی بابے بڈھے کی لاٹھی ہوں جو تم کو سہارا دوں میں تو ایک آرٹسٹ ہوں اور گانے کے لئے یہاں آئی ہوں۔ مجھے سہارا سہورا دینا کوئی نہیں آتا۔" اگلے دن وہ کل کا سہارا مانگنے والے کو گئے دن کا سہارا مانگنے والے کا نام بتا دیتی اور وہ برہم ہو کر ایک ایک سے شکایت کرتا کہ "ذرا اس کو دیکھو شرم نہیں آتی ایک لڑکی سے سہارا مانگتا ہے۔"

میں نے اس سے سہارا تو نہ مانگا البتہ اپنے ماسٹر بالی کا سارا قصہ الف سے لے کر یے تک اسے سنا کر اس سے ہمدردی اور رحمدلی کا طلب گار ضرور ہوا۔ وہ ایک متعصب قسم کی مسلمان لڑکی تھی۔ ماسٹر بالی کی تبدیلیٔ مذہب پر بہت ناراض ہوئی اور اس کو دو تین گالیاں دے کر مجھے بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ میں نے اسے اور شامل حال کرنے کے لئے یہ بھی بتایا کہ میں کلارنٹ بجا لیتا ہوں اور راگداری میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ مجھے اپنی برادری کا فرد جان کر اس نے دلی مسرت کا اظہار کیا اور مجھ سے میرے گھرانے کی بابت پوچھنے لگی۔ میں نے کہا "میں ہوشیار پور کا رہنے والا ہوں اور میرا تعلق شام چوراسی کے گھرانے سے ہے۔"

اگلے دن مفتی جی نے سکرپٹ کی کاپیاں جوڑتے ہوئے مجھ سے پوچھا "کون ہے بھئی وہ تمہارا استاد جو سکھ ہو گیا ہے؟"

میں نے حیران ہو کر کہا "میں تو کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو سکھ ہو گیا ہو اور جس نے اپنا آبائی مذہب چھوڑ دیا ہو۔" کہنے لگے "سنا ہے تمہیں راگ ودیا میں بھی دلچسپی ہے؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "صرف سننے سنانے کی حد تک۔"

"کوئی ساز بھی بجا لیتے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

میں نے کہا "مفتی جی میں لکھنے پڑھنے والا آدمی ہوں ہجڑا نہیں ہوں۔"

انہوں نے سکرپٹ سے نگاہیں اٹھا کر غور سے میری طرف دیکھا اور جھڑک کر کہا "شام چوراسی گھرانے میں تمہارا کون تھا؟"

میں نے گلا صاف کر کے کہا "میں نے تو یہ نام ہی پہلی مرتبہ سنا ہے۔"

انہوں نے بات کا پتہ کاٹتے ہوئے کہا "اچھا جاؤ اور الماری سے ساؤنڈ ٹریکس کی یہ ڈسکیں نکال کے لے آؤ۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ کنٹین کی چھوٹی پہاڑی کے ساتھ زمرد سازندوں کے ساتھ ٹین کی کرسی پر بیٹھی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ مجھے

دیکھ کر اس نے زور کی ہانک لگائی اور بولی "آؤ آؤ کبھی اپنوں کے ساتھ بھی بیٹھا کرو "سردار جی!"
میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور ڈیوٹی روم میں داخل ہو گیا۔

پہاڑوں کی ایک عجیب عادت ہے کہ وہ دن بھر چمکتی دھوپ میں ایک دوسرے سے چوٹیاں نکالے اپنے ماتھے اور سروں پر بادلوں کی پٹیاں باندھے کھڑے رہتے ہیں اور جب رات چھا جاتی ہے اور گھپ اندھیرا ہو جاتا ہے تو اپنے عزیز رشتہ دار پہاڑوں سے ملنے دور دور چلے جاتے ہیں۔ ان کے درمیان خاندانی تعلقات اور قرابت داری کی باتیں ہوتی ہیں اور وہ نئے رشتے طے کر کے سورج نکلنے سے پہلے واپس اپنے اپنے مقام پر آجاتے ہیں۔ میں نے اپنے ہوٹل کی کھڑکی سے کئی مرتبہ سامنے والے بڈھے پہاڑ کو رات کے اندھیرے میں سفر کرتے دیکھا تھا۔ وہ ایسی گربہ پائی سے اپنی جگہ سے سرکتا کہ سناٹے میں بھی اس کی آواز نہ آتی۔ لیکن ٹھنڈی سیت ہواؤں کو کاٹتے ہوئے ہواؤں کی آواز میں تبدیلی سے صاف پتہ چل جاتا کہ وہ کوہالے کی طرف جا رہا ہے اور اپنے چھوٹوں سے کچھ نئے گلے شکوے کرنے جا رہا ہے۔ اس کے چلنے میں اور جانے میں مجبوری کا پس ماندگی کا اور کھولت کا عنصر نمایاں ہوتا۔ رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں میں کئی کئی گھنٹے پہاڑوں کی سبک خرام موومنٹس کو واچ کیا کرتا حالانکہ نظر کچھ بھی نہیں آتا تھا لیکن پتہ صاف چل جاتا تھا۔

کوئی دس بارہ روز کے بعد جب میں بابا سنگل شاہ سے ملنے گیا تو اس کی جھونپڑی خالی تھی اور اس کے باہر ہار' پھول' پھلوں کے لفافے اور مٹھائی کے ڈونے بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ پہاڑی کوے چیڑھ کے اونچے درختوں پر خاموشی سے بیٹھے ویران کٹیا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کوہالا جانے والی ایک لاری جب کٹیا کے سامنے رکی اور کلینر نے آلو بخارے کا لفافہ ایک پرانے باسی ہار کے کنڈل میں رکھ کر سلام کیا تو میں نے آگے بڑھ کر اس سے بابا کی بابت پوچھا۔

کلینر نے کہا "سائیں سنگل شاہ پچھلی جمعرات یہ جگہ چھوڑ کر چلے گئے۔" جن لوگوں نے انہیں راستے میں دیکھا تھا وہ بتاتے ہیں کہ سائیں نانگا پربت کی طرف نکل گئے ہیں اور اب واپس نہیں آئیں گے۔"

وہ شاید مجھے کچھ اور بھی بتاتا لیکن ڈرائیور نے ہارن دے کر اسے بلا لیا اور وہ تیزی سے لپک کر چلتی ہوئی لاری کے دروازے سے لٹک گیا۔

سنگل شاہ کے اس طرح اچانک چلے جانے سے میں اور بھی اداس ہو گیا اور مجھے اپنے

OCIETY.COM

سرکار ماسٹر بالی شدت سے یاد آنے لگے۔ اس زمانے میں بھارت سے آنے جانے کے لئے کوئی ویزا سسٹم نہیں تھا۔ بس ایک پرمٹ کی ضرورت ہوتی تھی جو آسانی سے مل جاتا۔ اگر وہ چاہتے تو پرمٹ لے کر آسکتے تھے اور اگر میں چاہتا تو میں بھی پرمٹ لے کر جاسکتا تھا' لیکن میرا وہاں جانا خطرناک تھا۔ نہ وہ آئے نہ میں گیا۔ شاید ہم دونوں کے لئے خطرہ موجود تھا۔ میں نے آخر میں ایک لمبا خط لکھ کر لفافے میں ڈالا اور لفافہ اپنی ماں کے نام لاہور روانہ کر دیا کہ اسے کھول کر اندر سے جو لفافہ ملے اسے پوسٹ کر دیں۔ اپنے خط میں بھی میں نے یہی انسٹرکشن دی تھی کہ جواب مجھے لاہور کے پتہ پر بھجوائیں' وہاں سے مجھ تک پہنچ جائے گا' لیکن ایک طویل انتظار کے بعد بھی مجھے ان کا کوئی خط نہ ملا۔

زمرد کو نظامی صاحب نے واپس پشاور سٹیشن بھجوا دیا اور چند دنوں کے اندر اندر ہم سب پھر ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ لطیفے بازی کی محفلیں جمنے لگیں۔ مفتی نے اپنی شطرنج کی بساط پھر سے بچھالی۔ ان کے گھر نردیں پٹتی رہیں پیادے چلتے رہے اور شہ ملتی رہی۔ سارے سٹاف میں بس ایک عمر اکیلا رہ گیا تھا۔ اس نے زمرد کے چلے جانے کے بعد باقاعدگی سے نماز پڑھنی شروع کر دی اور اللہ سے لو لگا کر بیٹھ گیا۔ سنگل شاہ ٹھیک ہی کہتا تھا کہ "ر" کا کھونٹا تو اپنی جگہ قائم رہتا ہے بس "ب" اور "ن" میں جھگڑا شروع ہو جاتا ہے اور یہ جھگڑا اس وقت تک رہتا ہے جب تک بدن کا کوٹ گھر نہیں جاتا اور دیہہ کی ماڑی ڈیہہ نہیں جاتی۔

WWW.PAK

۱۲

پورے دو سال بعد جب میں اٹلی سے لوٹ کر آیا تو عمر ایک متقی' پرہیزگار اور پارسا آدمی بن چکا تھا اور اس کے سر کے پیچھے نور کا ایک ہالا سا بن گیا تھا جو دیکھنے والی آنکھ کو نظر تو نہیں آتا البتہ سر کے پیچھے بالوں کی چمک سے اندازہ ہوتا تھا کہ کہیں سے کوئی سپاٹ لائٹ آ رہی ہے جس کا مخرج دکھائی نہیں دیتا۔ لوگوں میں یہ خبر عام تھی کہ عمر نے خفیہ طور پر زمرد سے شادی کر لی ہے اور دونوں نے ایک دوسرے سے الگ رہ کر زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

محمد حسین کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ شادی کر لینے کے بعد میاں بیوی الگ الگ زندگی گزاریں۔ وہ پشاور میں رہے یا پنڈی میں۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ رہے یا اپنے گھر' وہ اپنی کمائی کرے اور اپنا کھائے یا اپنی ساری تنخواہ گھر لے جائے اور خبر ان کے ارد گرد یہی گھومتی رہے کہ انہوں نے شادی کر لی ہے۔ پشاور میں بھی یہی خبر گرم ہو اور پنڈی میں بھی اسی کا چرچا ہو۔ لوگ مان بھی چکے ہوں اور کوئی ثبوت بھی پیش نہ کر سکیں۔ اہے گہے اور ہکے بکے سے پھرتے ہوں' لیکن محمد حسین کے پاس اس کا ایک وزنی اور پائیدار ثبوت موجود تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ عمر ہفتے کی شام بس پکڑ کر پشاور چلا جاتا ہے اور اتوار کا سارا دن وہاں گزار کر پیر کی صبح سیدھا دفتر آ جاتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی درست نہیں تھی۔ عمر ہفتے کی شام کپڑے بدل کر بری امام چلا جاتا تھا اور اتوار کا سارا دن وہاں گزار کر پیر کی صبح دفتر پہنچ جاتا تھا۔ اس کی جیب میں بری کے بچ کی راکھ کی ایک پڑیا ہوتی' جسے وہ چاٹتا بھی تھا۔ آنکھوں میں بھی لگاتا تھا اور بینی سے اوپر ماتھے پر الف کا نشان بھی کھینچتا تھا۔ میں نے عمر کے سراپا کو غور سے دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے واقعی زمرد سے شادی کر لی ہے اور اب اس کی زندگی میں صرف نون کا جھگڑا رہ گیا ہے' جس نے "ب" کی صورت اپنا لی ہے اور

OCIETY.COM

"ب" بھی پانی کی لہروں میں اس کی نظروں کے سامنے ڈزالو ہوتی جا رہی ہے.....!

اٹلی میں میرا دو سال کا قیام دو منٹوں میں گزر گیا۔ یہاں ماسٹر بالی کے خط باقاعدگی سے بلکہ تواتر سے ملتے رہے اور ہم ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے جتنے اصل زندگی میں بھی نہیں تھے۔ میرا خیال تھا کہ انہیں اب یقین ہوا ہے کہ پاکستان نہ آ کر انہوں نے میرے روپ میں ایک ہیرا گنوا دیا ہے اور دیار غیر میں یوسف بے کارواں سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ بات ان کے خطوں سے عیاں نہ تھی' بس میرے دل کا خیال تھا' لیکن یہ خیال تھا بڑا مستحکم۔ یورپ آ کر دیسی لوگوں کے بارے میں جو خیال پیدا ہوتے ہیں وہ بڑے مستحکم اور مدلل ہوتے ہیں۔ ان میں ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ہر دلیل اپنے اپنے مقام پر نپی تلی اور وزنی ہوتی ہے۔ انحراف کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔

ریڈیو روم سے واپسی پر ایک شام مجھے سینٹ پیٹر کے بڑے صحن میں ایک سکھ جوڑا نظر آیا۔ سردارنی فوارے کے کنارے پٹی پر پاؤں رکھے اپنے سینڈل کی گھنڈی باندھ رہی تھی اور سردار ہاتھ میں بی او اے سی کا تھیلا اٹھائے اس کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے اپنا سکوٹر روک کر سٹینڈ پر رکھا اور ان کے قریب جا کر فتح بلائی۔ میری بولی سن کر وہ دونوں چونکے تو سردار نے ہاتھ آگے بڑھا کر کہا "بھاپا جی ہمیں تو آپ کی اٹالین نے مار دیا۔ تین دن سے پھر رہے ہیں کوئی ہماری بات ہی نہیں سمجھتا۔"

میں نے کہا "سردار جی اٹلی آؤ تو اٹالین سیکھ کر آؤ' نہیں تو دھکے کھاؤ۔"

دونوں میاں بیوی ہنسنے لگے تو اس کی بیوی نے پوچھا "ویر جی آپ نے اتنی اچھی پنجابی کیسے سیکھ لی۔"

میں نے کہا "بی بی میں اٹالین نہیں ہوں' پاکستانی ہوں اور پنجابی میری مادری زبان ہے۔"

سردار نے خوش ہو کر کہا "دیکھنے کو تو آپ بالکل اٹالین لگتے ہیں۔ پر آپ کا سبھاؤ بالکل پنجابیوں جیسا ہے۔ کتنی دیر سے ہیں یہاں؟"

میں نے کہا "میں کوئی ڈیڑھ برس سے یہاں مقیم ہوں۔ یونیورسٹی میں اردو پڑھاتا ہوں اور ریڈیو روم سے اردو سروس میں براڈ کاسٹ کرتا ہوں۔"

دونوں میری قابلیت سے بہت متاثر ہوئے' لیکن سردارنی سوچ میں پڑ گئی اور آخر پوچھے بنا نہ رہ سکی کہ میں پنجابی ہوتے ہوئے اردو کس طرح پڑھا لیتا ہوں۔

WWW.PAKS

سردار نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر کہا "ہے کہ سدین۔ اپنے گورمکھ سنگھ کا جواب نہیں' بابو دلیپ سنگھ 'وہ اردو میں شاعری کر لیتا ہے۔ بڑے بڑے اعلیٰ شعر بناتا ہے۔ دو کتابیں چھاپی ہیں اس نے۔ اردو کوئی مشکل تو نہیں بھجن کور۔"

میں ان کو اپنے ساتھ آہستہ آہستہ چلاتا پیاتزا دیل ری سورجی میںتو لے آیا اور چائے پینے کی غرض سے ہم ایک کیفے ٹیریا میں داخل ہو گئے۔ جب میں نے ہر بھجن کور سے پوچھا "بھابی آپ کیا پئیں گی چائے کہ کافی؟ تو سردار صاحب بلبلا کر بولے "چائے تو یہاں ایک دھیلے کے کام کی نہیں ہوتی۔ گرم پانی کی پیالی میں تھیلی سی ڈال دیتے ہیں۔ رنگ نکلتا نہیں' کبھی دھاگا منہ میں آجاتا ہے کبھی پرچی۔"

میں نے کہا "تو پھر کافی پی لیتے ہیں۔"

"ناں ویر جی ناں" ہر بھجن کور چہک کر بولی "میں نے تو ایک گھونٹ ہی پیا تھا۔ تھوکنے کو جگہ نہ ملی تو مجھے اندر نگلنا پڑا۔ بڑا ہی گندا سواد ہے' تتے ستوؤں جیسا۔ وہ نہ منگانا۔"

"تو پھر یوں کرتے ہیں" میں نے سوچتے ہوئے کہا "آئس کریم منگوا لیتے ہیں۔ یہاں کی آئس کریم ساری دنیا میں مشہور ہے۔"

آئس کریم پر دونوں رضامند ہو گئے تو میں نے بیرے کو بلا کر سمجھایا کہ گلاسوں میں آئس کریم لانا کون نہ اٹھا لانا۔ کون کھانے کا ان کو محاورہ نہیں ہے۔ ان کے قابو میں نہیں آئے گی۔ ان کے کپڑے خراب ہوں گے تمہارا فرش گندا ہو جائے گا۔ بیرا مسکراتا ہوں واپس چلا گیا تو سردار جی نے کہا "آپ تو واہ واہ اطالوی بول لیتے ہیں۔"

میں نے کہا "بس کام چلا لیتا ہوں۔ مشکل الفاظ میری سمجھ میں بھی نہیں آتے۔"

"مشکل بولی ہے؟" ہر بھجن کور نے معصومیت سے پوچھا۔

"بہت مشکل۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "بولنے میں تو پھر بھی آجاتی ہے' پر لکھنے میں پکڑائی نہیں دیتی۔ بڑے بڑے نامی گرامی اطالوی لکھاری غلطی کر جاتے ہیں۔"

"تو پھر تو ہماری پنجابی سب سے آسان ہوئی۔" سردار نے خوش ہو کر کہا "چاہے دو دن بولتے رہو کوئی غلطی نہیں ہوتی۔"

وہ دونوں لدھیانے کے رہنے والے تھے اور ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ جوالا سنگھ میٹرک پاس تھا اور ہر بھجن ایف اے پاس کر کے آگے پڑھنا چاہتی تھی کہ ان کی شادی ہو گئی۔ لندن میں جوالا سنگھ کے تایا جی بڑی دیر سے آباد تھے اور روڈے کا کاروبار کرتے تھے۔

OCIETY.COM

لندن میں ان کا اپنا گھر تھا۔ کاؤنٹی میں تھوڑی سی زمین بھی پٹے پر لے لی تھی' جہاں وہ کاروبار کے ساتھ ساتھ واہی تبی سے بھی دل بہلاتے تھے۔ جوالا سنگھ نے بتایا کہ پچھلے سال ان کے ٹماٹروں کو سارے ولایت میں اول نمبر انعام ملا تھا۔

یہ جوڑا اپنے تایا جی کے پاس پورا ایک مہینہ گزار کر اب واپس لدھیانے جا رہا تھا اور راستے میں اٹلی کی سیر کرنے کے لیے رک گیا تھا۔

جب میں نے ان سے اٹلی کی سیر کرنے کی وجہ دریافت کی تو جوالا سنگھ نے بتایا کہ سردار گورمکھ سنگھ کا بیٹا کرنیل سنگھ پہلے ہی اٹلی دیکھ چکا ہے اور ہر وقت اٹلی کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ ہماری ان کے خاندان کے ساتھ اڑ بھیس ہے' اس لیے میرے باپو جی نے کہا تھا کہ اٹلی ضرور دیکھ کر آنا تاکہ ہم گورمکھ کے ٹبر سے ہیٹے نہ رہیں۔ پھر اس نے سر ہلا کر کہا "یہ تو بڑا ہی مشکل دیس ہے' کسی کو کسی کی بات سمجھ ہی نہیں آتی۔ پرے گو! پرے گو ہی کرتے رہتے ہیں۔"

ہر بھجن کور نے کہا "میں پھر بھی کچھ کچھ سمجھ لیتی ہوں پر سردار جی کو تو اکا پتا نہیں چلا کہ کوئی کیہ رہا ہے۔"

جوالا سنگھ نے جھلا کر کہا "اوئے رہنے دو اپنی فیلسوفیاں' کل سے اپنا سینڈل گنڈھوانے کے لیے موچی تلاش کر رہی ہے۔ ہر ایک کو اپنا ننگا پیر اٹھا کر دکھاتی ہے اور ہر کوئی اسے ڈاکٹر کی دکان پر لے جاتا ہے۔"

میں نے کہا "آپ لوگ فکر نہ کریں' ابھی یہاں سے فارغ ہوتے ہیں تو بھابی کی جوتی گنڈھوا لیتے ہیں۔ یہاں قریب ہی ایک موچی کی دکان ہے۔"

جب ہم آئس کریم کھا رہے تھے جو جوالا سنگھ نے ران پر ہاتھ مار کر کہا "لو جی حد ہو گئی۔ ہم نے نہ بھاپا جی سے ان کا نام پوچھا نہ ان کا سرنامہ لیا۔ سارا ٹیم ایسے ہی گزار دیا۔" میں نے ان کو اپنا نام بتایا اور جیب سے اپنا کارڈ نکال کر سامنے میز پر رکھ دیا۔

ہر بھجن کور نے کارڈ اٹھا کر پڑھنے کی کوشش کی تو انالیں پر پھر رک گئی۔ بولی "ٹیلی فون نمبر تو میں سمجھ گئی ہوں پر سرنامہ نہیں اٹھایا جاتا۔"

میں نے کہا "جب ضرورت پڑے تو کسی سے پڑھوا لینا' ابھی تمہارے منہ پر نہیں چڑھ سکے گا۔"

ہر بھجن کور نے وزیٹنگ کارڈ اپنے پرس میں ڈالتے ہوئے کہا "یہ تو بھاپا جی آپ نے

WWW.PAKS

ارے کا پتہ بتایا' پیچھے کا تو بتایا ہی نہیں کہ آپ کا پیچھا کہاں کا ہے۔"

میں نے کہا "میں تخت پور کا رہنے والا ہوں۔" دونوں نے ہم زبان ہو کر اونچی آواز میں "تخت پور" کہا اور حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگے۔

جوالا سنگھ نے کہا' لو وحد ہو گئی۔ اس ماگھی کے میلے پر ہم تخت پور گئے تھے اور پورے دس دن وہاں رہے تھے۔ آسابٹر میں میری ماسی بیاہی ہوئی ہے اور میرا ماسٹر ہسپتال میں کمپاؤنڈر ہے۔ سردار ہردت سنگھ گرال۔"

میں نے فخر سے آنکھیں نچا کر کہا "دیکھا پھر ہمارا ماگھی کا میلہ۔ ہے کوئی اس کا جوڑ پورے پنجاب میں!"

ہر بھجن نے کہا "میلے کا تو بلاشک کوئی جوڑ نہیں بھاپاجی' پر میرا دل تو دربار صاحب کے شبد کیرتن نے لوٹ لیا۔"

"یہ تو وہاں سے اٹھتی ہی نہیں تھی۔" جوالا سنگھ نے کہا "میلہ مولا کوئی نہیں دیکھا۔ اس نے ارداس ہی سنتی رہی۔"

میں نے ایک مرتبہ پھر اپنا سر فخر سے اونچا کر کے کہا "ہمارے دربار صاحب کے گیانیوں کا کوئی جوڑ ہی نہیں۔ گیانی مہاں سنگھ گیانی بدھ سنگھ گیانی بادالہنا سنگھ....."

لیکن ہر بھجن کور نے میری بات بیچ ہی میں کاٹ دی اور آنکھیں بند کر کے تھوڑی اوپر اٹھا کر بولی "سارے گیانی سچے سارے ای گورو کے سیوک پر جو بات گیانی بھائی بابلی سنگھ میں ہے وہ اور کسی میں نہیں۔"

بابلی سنگھ کا نام سن کر میں چونکا تو وہ کہنے لگی "گیانی بھائی بابلی سنگھ پہلے مسلمان تھا۔ مونا تھا۔ پھر گورو کا سکھ بن گیا۔ کڑاڑال کے مکت ہو گیا۔ جب مکت ہو گیا تو واہگورا کال پرکھ نے سارا گیان اسی کی جھولی میں ڈال دیا۔"

جوالا سنگھ نے کہا "بات اچھی کرتا ہے اور کھول کے کرتا ہے۔ ڈوہنگی گل بھی شیشہ ہو جاتی ہے۔ کوئی دھارک بل فریب نہیں رہتا۔"

ہر بھجن کور عقیدت سے سر ہلاتے ہوئے بولی "نہ مان نہ ہیکڑی' نہ لوبھ نہ لالچ' بس پریم ہی پریم' کرپا ہی کرپا۔ دوسرے گیانیوں کی طرح دیدے پھاڑ پھاڑ کے نہیں دیکھتا' نظریں بند بند سی رکھتا ہے۔ میرا تو دل کرتا تھا کہ تخت پور میں ہی رہ جاؤں اور ہر روز ان کے شبد کیرتن میں بیٹھا کروں۔"

OCIETY.COM